جناب احمد ندیم قاسمی

اقبال کا نظریۂ شعر

صرف "بانگِ درا" میں اردو، فارسی اور انگریزی کے چھ شعرا پر علامہ اقبال کی پانچ نظمیں شامل ہیں۔ (ایک نظم "شبلی و حالی" میں دونوں پر بیک وقت اظہارِ خیال کیا ہے)۔ ان نظموں کی مدد سے اقبال کا نظریۂ شعر بڑی آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے۔ اور اگرچہ یہ سب ان کے ابتدائی دورِ شاعری کی تخلیقات ہیں، مگر جو نظریہ ان سے مرتب ہوتا ہے، اس کا اطلاق بعض معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے آخری دورِ شاعری پر بھی ہو سکتا ہے۔ "بانگِ درا" میں دو نظمیں ایسی بھی شامل ہیں جن میں شاعر کے منصب کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان دونوں کا عنوان "شاعر" ہے۔ پھر "سید کی لوحِ تربت" اور "عبدالقادر کے نام" میں بھی ان کے نظریۂ شعر کی چند جھلکیاں موجود ہیں۔ اس نظم میں جس کا عنوان "عبدالقادر کے نام" ہے اقبال نے جیسے اپنی شاعری کا منشور مرتب کر دیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے "بالِ جبریل" "ضربِ کلیم" "ارمغانِ حجاز" اور اپنی فارسی تصانیف میں اس منشور کے مطابق شاعری کی ہے۔

عبدالقادر کے نام

جس طرح غالب نے کہا تھا کہ:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم

اسی طرح اقبال نے شیخ عبدالقادر سے مخاطب ہو کر کہا تھا:

بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اور

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں   خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اقبال اس نظم میں کہتے ہیں کہ اپنی بساط فریاد ہی تو ہے مگر یہ ایسی فریاد ہے جو محفل کو تہ و بالا کر سکتی ہے، آؤ کہ ہم عشق کی قوت ——— لگن کی قوت سے سنگِ امروز کو اتنا صیقل کریں کہ وہ

آئینۂ فردا بن جائے۔ قوم کو اس کی کھوئی ہوئی قوت و حشمت کا احساس دلائیں۔ چمن کو آئین نمو سکھائیں تاکہ شبنم کا ایک ایک قطرہ ایک ایک دریا کی روانی اور بیکرانی اختیار کرلے۔ اقدار بدل رہی ہیں۔ (دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار) اس لیے اپنے ہم عصروں کو نئی اقدار سے متعارف کرائیں۔ (قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں)۔ ہم نے یورپ کے تخ ماحول میں بیٹھ کر جو کچھ سوچا تھا اور اپنے ذہنوں کو ان سوچوں سے گرمایا تھا، انھیں یہاں مشرق میں عام کریں اور اس اعتماد کے ساتھ جلیں کہ ہمارے جلنے سے روشنی عام ہوگی اور لوگوں کی آنکھوں میں بینائی لوٹ آئے گی۔ اقبال کا کلام گواہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ اپنے انتقال سے تیس بتیس برس پہلے کہا تھا، وہ محض جوانی کے جوش میں یا جذباتیت کی زد میں آکر نہیں کہا تھا بلکہ پورے غور و فکر کے بعد انھوں نے شاعر کا منصب متعین کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس منصب کو اپنے دور کے سیاسی حالات اور تاریخ کے حوالے سے پرکھا تھا اور اندھیرے میں تیر نہیں چلایا تھا بلکہ انھیں اپنے ہدف کا شعورِ کامل حاصل تھا، اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ایک ایسے راستے پر گامزن ہوئے تھے جس پر بعد میں پوری قوم چلی۔ "عبدالقادر کے نام" میں تو اقبال نے بہت کھل کر اپنے فن کارانہ عزائم کا اظہار کیا ہے مگر دیگر (متذکرہ) نظموں میں بھی (بالواسطہ طور پر ہی سہی) وہ اپنے نظریۂ شعر کو غیر مبہم انداز میں بیان کرتے چلے گئے ہیں اور کسی ایک مقام پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ انھوں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس پر بعد میں وہ عمل نہ کر سکے ہوں۔ ممکن ہے اس وضاحت سے بعض لوگوں کو یہ گمان گزرے کہ اقبال نے اپنی بے ساختگی پر پہرے بیٹھا لیے تھے اور اپنے آپ کو پابند کر لیا تھا ــــ مگر گزارش یہ ہے کہ بڑے شاعر خود کو بعض نظریات کا پابند کر لینے کے باوجود اپنی بے ساختگی کو مجروح نہیں کرتے اور جو شاعر کسی فنی یا تہذیبی نقطۂ نظر کا پابند نہیں ہوتا وہ اپنی بے ساختگی کو صرف اس حد تک کام میں لاتا ہے کہ آخری دم تک خود اُسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا کتنا رہا ہے۔

"شاعر" کا منصب

"شاعر" کے عنوان سے دو نظمیں "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ پہلی نظم حصۂ اول میں ہے اور ۱۹۰۵ء سے قبل کی تخلیق ہے۔ دوسری حصۂ سوم میں ہے اور ۱۹۰۸ء کے بعد کی تخلیق ہے مگر خوشگوار حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں جگہ شاعر کے مناصب مربوط ہیں۔ پہلی نظم میں اقبال نے قوم کو جسم قرار

دیا ہے ۔ افراد کو اس جسم کے اعضا کہا ہے ۔ (یہ اعضا "منزل صنعت" کے رہ پیما ہیں) "محفل نظم حکومت" قوم کا "چہرۂ زیبا" ہے اور شاعر قوم کا "دیدۂ بینا" ہے شاعر کو پیکر قوم کی آنکھ قرار دینے کے بعد اقبال نے بڑے فن کارانہ حسن کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ شاعر قوم کے کسی دکھ، کسی مصیبت، کسی آزمائش سے بے توجہ نہیں رہ سکتا ۔ وہ ایسا کرے گا تو اپنے پاکیزہ منصب کی نفی کا مرتکب ہوگا، کیونکہ :

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ　　کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

"شاعر" کے عنوان کی دوسری نظم میں اس نقطۂ نظر کو ذرا وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور قوم سے ہمدردی اور اس کے مصائب میں شرکت کے علاوہ شاعر پر فرض کر دیا ہے کہ وہ (ان مصائب کے خاتمے کے لیے) کھری بات کہے ۔ وہ کھری بات کہے گا تو جبھی ویرانۂ حیات میں بہار آئے گی ۔ جب قوم بت سازی اور بت گری پر اتر آئے تو شاعر کے کلام کو شانِ جلیل دکھانی چاہیے اور کارِ خلیل کرنا چاہیے ۔ اقبال نے اس نظم میں یہ بھی کہا ہے کہ جو شاعری خونِ جگر سے پرورش پاتی ہے، وہ عامِ انسانیت کے لیے زندگیٔ دوام کا نسخہ ثابت ہوتی ہے ۔ الغرض اگر پہلی نظم میں شاعر کا منصب معین کیا گیا ہے تو دوسری نظم میں اس منصب کا حق ادا کرنے کے لیے شاعر کے لیے راہِ عمل مقرر کی ہے اور اسی شاعری کو (جس میں شاعر اپنی نوع اور اپنی قوم اور اپنے معاشرے کی بعض ذمّہ داریاں قبول کرتا ہے) زندگی کی چہل پہل، اس کی شادابی اور بالیدگی کی بنیاد قرار دیا ہے :

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو　　پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

سیّد کی لوحِ تربت

"سیّد کی لوحِ تربت" میں اقبال شاعر کو اپنے وقار اور "آبرو" کا تحفظ کرنے کی تلقین کرتا ہے :

ہو نہ جائے، دیکھنا، تیری صدا بے آبرو

یہ صدا کی بے آبروئی بہت ہی بڑا سانحہ ہے جو کسی شاعر پر گزر سکتا ہے ۔ شاعر کی صدا کی آبرو صرف اس طرح محفوظ رہ سکتی ہے کہ بقول شاعر :

جو کچھ کہوں، یقیں سے کہوں، برملا کہوں

وہ جو کچھ کہے، اپنے اعلیٰ منصب کو پیشِ نظر رکھ کر کہے ۔ پھر وہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اسے

علم ہو کہ اس کی صدا صرف اس تک محدود نہیں ہے بلکہ اُسے دنیا میں پھیلنا ہے اور دنیا کو رنگ و بو کی، شادابی و نمو کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اس نظم میں شعرا کو یہ احساس بھی دلایا ہے کہ جو اقدار مرگئیں وہ مرچکیں اور نئی قدروں، نئے معیاروں سے بدکنا بیکار ہے، اس خیال کو اقبال نے ایک اور جگہ بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا ‏ ‏ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

"سبز کی لوحِ تربت" میں انھوں نے واشگاف اور براہِ راست انداز میں کہہ دیا ہے کہ:

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ ‏ ‏ رنگ پر جو اَب نہ آئیں، ان فسانوں کو نہ چھیڑ

انھوں نے شاعر سے کہا ہے کہ پرانی لکیروں کو پیٹنے کی بجائے:

سونے والوں کو جگادے شعر کے اعجاز سے ‏ ‏ خرمنِ باطل جلادے شعلۂ آواز سے

داغ، شبلی، حالی

یہ شعر و شاعری کی باتیں تھیں مگر جب اقبال شاعروں کا ذکر کرتے ہیں تو جب بھی اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ان نظموں میں ان کا نظریۂ فنِ شاعری بھی پوری جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہ نظمیں داغ، شبلی و حالی، غالب، عرفی اور شیکسپیئر کے متعلق ہیں۔ داغ کے مرثیے میں انھوں نے داغ کے بانکپن اور شوخیٔ بیان کا ذکر کیا ہے۔ یہ بتایا ہے کہ پیری میں بھی ان کے رنگ ڈھنگ جوانوں کے سے تھے۔ عشق کی ہو بہو تصویر کھینچتے تھے۔ ہر شخص کے دل کی بات کہتے تھے اور تخیل کی پرواز کے دوران بھی زمین سے اپنا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔ اس سے زیادہ اقبال نے داغ کے بارے میں کچھ نہیں کہا اور انھیں کہنا بھی نہیں چاہیے تھا کیونکہ ان کا نظریۂ فن، داغ کے نظریۂ فن سے یکسر مختلف تھا۔ بہرصورت داغ کے اس مرثیے سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ بیان کی شوخی، اظہار کا بانکپن اور معاملاتِ عشق کی شاعری اقبال کے نزدیک کوئی گناہ نہیں تھی۔ بصورت دیگر ہم اقبال کے بعد کے کلام میں اس قسم کے سراپا جمال اشعار کہاں پاتے کہ:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال ‏ ‏ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشین

شبلی و حالی کا مرثیہ دراصل اس شعر کی تضمین ہے:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان ‏ ‏ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اس مرثیے میں اقبال ایک مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو منفرد ہے۔ نئے نئے علوم دراصل تیرا سرودِ رفتہ ہیں۔ تیرے پرانے قافلوں کی گرد کا نام تہذیب قرار پایا ہے۔ تو نے مردانہ وقار و آبرو کے معیار قائم کیے ہیں۔ پھر آج کل جو تیرے گلشن پر خزاں کی یلغار ہے تو اس کا راز گلشن کے پرانے رازداروں سے پوچھ کہ مردانِ کار مصائب پر محض روتے رلاتے نہیں ہیں بلکہ حادثات کے اسباب ڈھونڈ کر مصائب کا علاج کرتے ہیں۔ اس پر مسلم جواب دیتا ہے کہ کس سے پوچھوں جبکہ گلشن کے وہ سبھی پرانے رازدار خاموش ہو گئے ہیں جن کی نوائے درد ملتِ اسلامیہ کے لیے سرمایۂ گداز تھی:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستان　　　حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

یہ مرثیہ اقبال کے اس منثور شاعری (عبدالقادر کے نام) کے عین مطابق ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو　　　تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

عرفی، شیکسپیئر، غالب

اقبال کا نظریۂ شعر ان نظموں میں بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے جن کے عنوان عرفی، شیکسپیئر اور مرزا غالب ہیں۔ عرفی کے بیان میں وہ کہتے ہیں کہ اس نے تخیل کا ایک ایسا ایوان تعمیر کیا جس کی عظمت و شوکت پر سینا و فارابی کے "حیرت خانے" قربان کیے جا سکتے ہیں۔ پھر:

فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی

کہ جس سے آج بھی درد کے سوتے اُبل رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ روحِ عرفی سے کہتے ہیں کہ اب لوگوں میں وہ اضطراب، وہ بے تابی، وہ بے قراری ڈھونڈے سے نہیں ملتی، اس سیمابی کیفیت کا کہیں نام نہیں ہے جو ارتقائے حیات کے لیے ضروری ہے اور تو جس کا ایک بلیغ نمائندہ تھا:

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر　　　گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

اس پر روحِ عرفی، شاعر سے کہتی ہے کہ گلے شکوے نہ کر بلکہ:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　　حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اور کون انکار کر سکتا ہے کہ روحِ عرفی کا یہ مشورہ اقبال کے نظریۂ فن کا عنوان ہے۔

شیکسپیئر کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح دریا، شفقِ صبح کا آئینہ ہے اور حسن حق کا آئینہ ہے اور دل، حسن کا آئینہ ہے۔ اسی طرح تیرا حسنِ کلام دلِ انسان کا آئینہ ہے۔ تیری فکر

فلک رس تھی۔ تیری آنکھ نے عالم کو عُریاں دیکھا (حالانکہ چشمِ عالم تجھے نہ دیکھ سکی کیونکہ تو تو خورشید میں تابِ خورشید کی طرح پوشیدہ تھا) اور :

حفظِ اسرار کا، فطرت کو ہے سودا ایسا — رازداں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

یوں اقبال نے اس نظم میں اعلیٰ شاعری کو محسوسات و تصوراتِ انسانی کا آئینہ، فکر کی بلندی کو اعلیٰ شاعری کا لازمہ اور اسرارِ فطرت کی رازدانی کو اعلیٰ شاعری کی پہچان قرار دیا ہے اور یہی عناصر اقبال کے نظریۂ شعر کے لازمی جز ہیں۔

مرزا غالب کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبال نے تخیل کی بلند پروازی، روح بدن کے رشتوں کے ادراک، اور حُسن کی اس جستجو کی اہمیت واضح کی ہے جو زندگی کو جامد نہیں رہنے دیتی بلکہ اُسے ہمہ وقت بیدار و بے قرار رکھتی ہے اور انسان کو نئی سے نئی دنیاؤں سے متعارف کراتی ہے:

تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

پھر اس نظم میں اقبال نے اس نکتے (اپنے منشورِ شاعری کی اس شق) پر بھی زور دیا ہے کہ غالب کی طرح سچا شاعر وہ ہے جس کی نوا زندگی سے کچھ چھینے نہیں بلکہ اس کے سرمائے میں اضافہ کرے۔ اس کا شعر زندگی کا عکاس ہو۔ شاعر کا حسنِ گویائی ایسا مسحور کن ہو کہ تصویریں بول اُٹھیں اور جمود چیخ کر اُبلنے لگے۔ پھر اقبال نے متذکرہ نظم میں یہ نازک نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ محض تخیل کی بلند پرواز عظیم شاعری کی تخلیق پر قادر نہیں ہو سکتی۔ غالب کی سی عظیم شاعری تخلیق کرنے یا غالب کی پیروی کرنے کے لیے تخیل کی بلندی میں فکر کی بلندی کو بھی شامل کرنا ہوگا۔

اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اقبال نے ان نظموں میں شعر و شاعری کے بارے میں جو بھی نظریات پیش کیے ان پر عمر بھر عمل کیا اور یوں وہ دنیا کی عظیم شاعری کے علاوہ زندگی کے سرمائے میں بھی بے پناہ اضافہ کر گئے۔